دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور جدید تقاضے

الطاف جاوید

آج ملت اسلامیہ کی نئی نسل شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ وہ یورپ کی صنعتی اور سائنسی چمک سے مرعوب ہے۔ مغربی تہذیب کی ظاہری اور سطحی چمک دمک سے واقعی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں لیکن یہ تہذیب اپنے سرمایہ دارانہ مزاج کی وجہ سے جس داخلی بحران سے دوچار ہے ہمارے نوجوان شاید اس سے پوری طرح آگاہ نہیں۔ ملت اسلامیہ کے اصحاب فکر ونظر نے کئی بار مرض کی تشخیص کی ہے مگر اب تک کوئی موثر علاج عمل میں لایا نہیں جاسکا۔ چونکہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں مغرب سے پیچھے ہیں اس لیے جہاں ہم مغربی اقوام سے علوم وفنون حاصل کرتے ہیں، وہاں اپنی شکست خوردگی کی وجہ سے تباہ کن بیمار قدریں بھی درآمد کرتے ہیں، چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ نوجوان نسل دن بدن مغربی اور غیر اسلامی تہذیبوں کے منفی اثرات کو اپناتی چلی جارہی ہے۔ اپنانے کا یہ عمل صرف لباس، زبان اور دیگر ظواہر تک ہی محدود نہیں بلکہ ذہنی طور پر یورپ کے دم

توڑتے ہوئے افکار و آراء کو بڑی تیزی کے ساتھ اپنانے کی فکر میں ہیں۔ اس مرض میں پاکستان ہی نہیں بلکہ مسلم دنیا کی پوری جدید نسل بھی مبتلا ہے۔

ہمارے پاس بڑی بڑی مساجد ہیں۔ مذہبی دارالعلوم ہیں، علماء ہیں، جو کئی کئی گھنٹوں تک اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے ہیں۔ مغربی تہذیب پر صحت مند اور غیر صحت مند تنقید کا ایک دفتر موجود ہے، اقبال کی فکری ونظری جدوجہد بھی موجود ہے۔ ہمارے رہنما آئے دن نئے نئے اصلاحی پروگرام بھی پیش کرتے رہتے ہیں ہمارے ہاں ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو دین حق کی تجدید کا دعویٰ رکھتے ہیں مگر حیران کن بات یہ ہے کہ اس ساری جدوجہد کے باوجود ہماری نئی نسل ہمارے ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے۔ وہ ہمارے قدیم مدرسۂ فکر کے ہاں شاید ملحد ہے اور جدید تعلیم یافتہ رہنماؤں کے ہاں قلق و اضطراب کا موجب، لیکن اس واقعہ کا سائنسی جائزہ لینے کی کسی میں ہمت نہیں ہے۔

جب مسلم نوجوانوں کے ذہنی انتشار اور اخلاقی انحطاط کا سائنسی جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے خلفشار کا سب سے بڑا سبب زندگی میں ثنویت پسندی Dualism کا نفوذ ہے۔

ثنویت پسندی کیا ہے؟

ثنویت پسندی کی اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ کسی قوم کی ذہنی اور علمی زندگی میں دو ایسے تضاد و متصادم رجحانوں کا بیک وقت برسرعمل ہونا جن میں کسی طرح بھی اتحاد و تعاون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ثنویت پسندی کے رجحان سے قوم کی ساری قوتوں میں انتشار پیدا ہوجاتا ہے۔ قومی اَنا کی سالمیت پارہ پارہ ہوجاتی ہے۔ کردار کی بلندی و پاکیزگی مفقود ہوجاتی ہے۔ بالیدگی اور نشوونما دینے والی قوتیں تباہ ہوجاتی ہیں چنانچہ پوری قوم ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوجاتی ہے اور اس میں زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی سطحی نقالی اور ظاہری چمک دمک کی پیروی کا رجحان پیدا ہوجاتا ہے۔

ثنویت پسندی کا یہ رجحان ملت اسلامیہ کی زندگی کے تمام گوشوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کی وجہ سے ملت کا نظریہ اس کے عمل سے جدا ہو چکا ہے اور اس کا دین دنیا سے الگ ہو چکا ہے۔ اور اس تضاد کا سب سے نمایاں اثر اس کے تعلیمی نظام میں پایا جاتا ہے۔

ہمارا تعلیمی نظام پچھلی دو صدیوں سے دو متضاد خانوں میں بٹ چکا ہے، ایک طرف قدیم دارالعلوم اور دینی مدرسے ہیں جن میں قدیم دینی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے اور دوسری طرف جدید یونیورسٹیاں ہیں جو عہد حاضر کے علوم سے ذہنوں کی آبیاری کر رہی ہیں اس طرح یہ مذہبی دارالعلوم اور یونیورسٹیاں دو مختلف قسم کے ذہن پیدا کر رہی ہیں۔ جن میں باہمی کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ زندگی کے مسائل و مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دونوں کے نقطہ ہائے نظر ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں، ایک ماضی کی طرف دیکھ رہا ہے تو دوسرا مستقبل کے خاکے بنانے میں مصروف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج درس نظامی اور جدید علوم دونوں ابن رشد، غزالی، البیرونی و ابن حزم پیدا کرنے سے قاصر ہیں جن کی ذہنی شخصیت دوہری نہیں تھی۔ بلکہ ان کے افکار میں ماضی و حال ایک جدت کی حیثیت سے سموئے ہوئے تھے۔ اس وحدت سے تابناک مستقبل کی صبح مسکراتی تھی۔

اسلام زندگی کو ایک نامیاتی کل (Organic Whole) تصور کرتا ہے، اس کل کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا اور جانچا تو جاسکتا ہے مگر ان کو ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ان کے درمیان گہرا رابطہ پایا جاتا ہے اور یہ ایک دوسرے پر اثر ڈالتے اور ایک دوسرے سے اثر قبول بھی کرتے ہیں، ان میں باہمی طور پر ایک اٹوٹ رشتہ پایا جاتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان تمام پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو وقت کی ضرورت کے تحت باقی پہلوؤں سے اہم قرار دے دیں اور اپنی توجہ کی زیادہ مقدار اس پر خرچ کریں مگر یہ بات شاید ناممکن ہے کہ اس پہلو کو باقی پہلوؤں سے قطعاً علیحدہ کر کے

اس سے کام لے سکیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام اپنے نظریاتی اور فکری ڈھانچہ میں کسی قسم کی ثنویت اور مشرکانہ خیالات کو برداشت نہیں کرتا یہ دونوں نظریات اسلام کی روح کے قطعاً مخالف ہیں۔

اسلامی نظام تعلیم کا مسئلہ

اسلامی تعلیمات کے سیاسی، معاشی، عمرانی اور فکری پہلو جس طرح آپس میں متحد ہیں، اسی طرح اس کا تعلیمی پہلو بھی ان کے ساتھ پیوستہ ہے ہم اسلامی نظام تعلیم میں کسی قسم کی ثنویت کو راہ نہیں دے سکتے۔ اگر ایسی کوشش کریں تو اسلام کا تعلیمی نظام اپنی افادیت کھو دے گا، اس سے انسان دوست اور حیات پرور نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔

مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟ اسلام کے تعلیمی نظام کی زمین میں ثنویت کے پودے کی آبیاری پچھلی دو صدیوں سے کی جارہی ہے۔ اس کے تعلیمی ڈھانچہ کو دینی اور دنیاوی خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ نہ دین رہا اور نہ دنیوی ترقی ہاتھ آئی۔

دراصل دین اور دنیا کی تقسیم کا تصور ہی غیر اسلامی ہے کیونکہ اسلام ایک ہدایت ہے اور حیات انسانی کے لیے تزکیہ و ارتقاء اور امت کے لیے اتحاد و یک جہتی کا ایک پروگرام ہے۔ چنانچہ اسلام اپنے اس پروگرام میں کسی طرح کی اوہام پرستی، مذہبی گروہ بندی اور غیر تخلیقی ماضی پرستی کو برداشت نہیں کرتا کیونکہ اسلام کا یہ پروگرام بیک وقت دنیوی بھی ہے اور دینی بھی، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ خالص دنیوی ہدایت ہے۔ جو اس معنی میں دینی ہے کہ یہ مادی زندگی کو ایک نصب العین عطا کرتی ہے اور زندگی کو ایسے خطوط پر استوار کرتی ہے کہ جو اسے ایک صحت مند اور پاکیزہ انقلاب سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ انقلاب نہ صرف اسے قرب الٰہی کی متاع بے بہا عطا کرتا ہے بلکہ اس دنیا میں بھی اسے انسانیت کا اونچا مقام دلاتا ہے، اس مقصد کے لیے زندگی کو دینی اور دنیوی خانوں میں تقسیم کرنا بے سود ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے کیونکہ ہر دنیوی عمل دینی بھی ہوسکتا ہے اور

غیر دینی بھی اگر وہ زندگی کے لیے صحت مند ہے تو دینی ہے اور اگر تخریبی اور منفی رجحانات کا حامل ہو تو دنیوی ہے، لہٰذا دین اور دنیا کی تقسیم اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیمی نظام کے ذریعہ ہی قومی زندگی اپنی داخلی تمناؤں اور نصب العین کا اظہار کرتی ہے ہم نظام تعلیم کے ذریعہ ہی اس ممتاز شخصیت کو حاصل کر سکتے ہیں جس کا تصور اسلام دیتا ہے اگر تعلیمی نظام ہی کو دینی اور دنیوی خانوں میں بانٹ دیا گیا تو اس موعودہ اسلامی شخصیت کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ قومیں اپنی داخلی زندگی کا اظہار تعلیم کے میدان میں کرتی ہیں ان کی داخلی زندگی ان کے نظریات و افکار ان کے جذبات و عواطف اور نصب العین پر مشتمل ہوتی ہے کسی قوم کی داخلی زندگی کا مطالعہ اگر مقصود ہو تو اس کے نظام تعلیم کو دیکھنا پڑتا ہے کیونکہ نظام تعلیم ہی اس قوم کے افراد کی مکمل شخصیت کو امتیازی سانچے میں ڈھالتا ہے۔

محکوم اور پسماندہ اقوام کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخصوص تہذیبی مزاج کے مطابق اپنے افراد کی شخصیتوں کی تعمیر نہیں کر سکتیں کیونکہ کسی غیر قوم کے سیاسی غلبہ یا اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ اپنے نظام تعلیم کو اپنے تہذیبی مزاج اور وقت کے جدید تقاضوں کے موافق مرتب و استوار نہیں کر سکتیں۔ زندہ اور باہوش قومیں سب سے پہلے اپنے نظام تعلیم کو درست کرتی ہیں تاکہ وہ فکر و نظر اور علم و فن ان کے قومی مزاج اور تہذیبی اثاثہ سے بے بہرہ نہ ہونے پائے۔

برعظیم پاک و ہند میں جب انگریز، یورپ کی جدید صنعتی اور سائنسی تہذیب لے کر پہنچا تو ہمارے ہاں کا نظام تعلیم عام طور پر درس نظامی پر مشتمل تھا جس میں اسلامی تہذیب کے بنیادی علوم کے ساتھ اس عہد کے عصری مباحث بھی شامل تھے۔

درس نظامی کے نصاب اور تاریخ پر ایک نظر

عالم اسلام سے قطع نظر کم از کم ہندوستان کے مدارس میں جو نصاب رائج تھا،

اس کا تذکرہ بے حد ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ہمارے بزرگوں نے کن ضروریات کے تحت کس قسم کی کتب کو شامل نصاب کیا تھا اور پھر ان میں کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

ہندوستان کے دینی مدارس کی تاریخ پر 1909ء میں ایک تحقیقی مقالہ مولانا سید عبدالحئی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے تحریر کیا ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ:

> ''مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہولت کے لحاظ سے نصاب درس کے چار دور قائم کریں اور جو کتابیں ہر دَور میں مروج تھیں ان کی تفصیل جہاں تک تاریخ سے، سیر سے، مشائخ کے طبقات سے، شعرا کے تذکروں سے اور مکتوبات و ملفوظات سے مل سکتی ہے یک جا کردیں۔ دیکھنے کو تو یہ ایک ذرا سا کام ہے مگر مختلف کتابوں کے ہزار ہا صفحے الٹنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، جو ناظرین کے سامنے آج پیش کرتے ہیں۔''

مولانا موصوف نے جن ادوار کا تعین کیا ہے اب ان پر ذرا تفصیلی نظر ڈالیے۔

دورِ اول:

اس دور کا آغاز چودھویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوتا ہے اور سولھویں صدی کے تقریباً وسط میں ختم ہوجاتا ہے کم و بیش دو سو سال تک مدارس میں صرف، نحو، معانی، اصولِ فقہ، فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر اور حدیث جیسے دینی اور دنیوی علوم پڑھائے جاتے رہے۔ ان میں سے نصف تعداد دنیوی علوم سے تعلق رکھتی ہے اور یہ علوم دینی علوم کی تحصیل میں مدد معاون سمجھے جاتے ہیں۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں معیار فضیلت فقہ اور اصول فقہ کو مقرر کیا گیا ہے۔ حدیث برائے نام ہے۔ ''مشارق الانوار'' ہی پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور اگر کسی نے مصابیح السنہ (مشکاۃ المصابیح کا متن) پڑھ لی تو اسے حدیث کے فن میں امام تصور کرلیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان

میں مسلم حکومت قائم کرنے والے غزنی اور غور سے آئے تھے۔ اور یہ قومیں فلسفیانہ ذہن نہیں رکھتی تھیں اس لیے ان شہروں میں فقہ میں ماہر ہونا وجہ فضیلت تھا، اور اسی وجہ سے اس دور میں فقہی روایات کا درجہ بلند رہا ہے۔ اور حدیث کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی ضیا برنی نے علاؤ الدین خلجی کے حالات میں بیان کیا ہے کہ مولانا شمس الدین ترک مصری محدث ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج کے ارادہ سے آئے مگر ملتان تک آکر واپس چلے گئے اور ایک رسالہ بادشاہ کے نام لکھ گئے جس میں اسے علم حدیث سے غفلت برتنے پر توجہ دلائی گئی تھی لیکن بعض فقیہوں نے یہ رسالہ بادشاہ تک نہ جانے دیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ساتھ غیاث الدین تغلق کے دربار میں پیش آیا۔ یہ واقعہ سماع سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ سماع کے جواز میں حدیث پیش فرماتے تھے، مگر فقہا کہتے تھے کہ یہاں حدیث پر فقہی روایات مقدم ہیں۔ ہندوستان کے مدارس میں اس کے بعد بھی طویل عرصہ تک حدیث کو اولیت نہ دی گئی۔ یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اٹھارویں صدی عیسوی میں علم حدیث کی اہمیت اور اولیت کا احساس دلایا۔ اس دور کے نصاب تعلیم میں ذیل کی کتب شامل تھیں۔

علم نحو:	مصباح، کافیہ، لب الالباب از قاضی ناصر الدین بیضاوی، ارشاد از قاضی شہاب الدین دولت آبادی
فقہ میں:	ہدایہ
اصول فقہ:	منار اور اس کے شروح اور اصول بزدوی
تفسیر:	مدارک، بیضاوی اور کشاف
تصوف:	عوارف المعارف، فصوص الحکم، بعد میں نقد الفصوص و لمعات داخل نصاب کی گئیں، خاص طور پر جو خانقاہوں سے متعلق تھے۔
حدیث:	مشارق الانوار، مصابیح السنہ (یعنی مشکاۃ المصابیح کا متن)

ادب: مقامات حریری زبانی یاد کی جاتی تھی

منطق: شرح شمسیہ

کلام: شرح صحائف اور بعض مدارس میں تمہید ابوشکور سالمی

دور دوم:

سولہویں صدی کے وسط میں ملتان سے دو جید عالم، شیخ عبداللہ دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ سنبھل میں تشریف لائے۔ یہ سکندر لودھی کا زمانہ تھا، اس نے ان دونوں علماء کی بہت ہمت افزائی کی انہوں نے فقہ اور اصول کی جگہ معقولات یعنی منطق و فلسفہ میں قابل قدر اضافے کیے۔ چنانچہ بدایونی لکھتا ہے کہ:

''کہ یہ دونوں بزرگ ملتان کی تباہی کے وقت ہندوستان میں آئے اور معقولات کو اس ملک میں رواج دیا۔ اس سے پہلے علم منطق اور کلام (فلسفہ) میں شرح شمسیہ و شرح صحائف داخل نصاب نہیں تھیں۔''

اس دوسرے دور میں میر سید شریف کے شاگردوں نے منطق میں شرح مطالع اور کلام میں شرح مواقف کو داخل نصاب کیا علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے علم بلاغت میں مطول و مختصر معانی اور کلاء میں شرح عقائد نسفی اور اصول فقہ میں تلویح کو داخل کیا۔ اس دوسرے دور میں فقہ میں شرح وقایہ اور نحو میں شرح جامی داخل نصاب ہوئی۔ لہٰذا دور اول میں درسی کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے اگر ان میں مطالع و مواقف اور ان کی شرحیں مطول و مختصر، تلویح، شرح عقائد نسفی، شرح وقایہ اور شرح جامی کا اضافہ کرلیا جائے تو دور دوم کے نصاب کی مکمل فہرست سامنے آجاتی ہے۔

اس دور دوم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معقولات کو فقہ و اصول فقہ پر ترجیح دی گئی اور سکاکی کی مفتاح العلوم، قاضی عضد کی مطالع و مواقف کو

منتہیانہ کتاب کی حیثیت دی گئی جن کے بغیر طالب علم کو دستار فضیلت نہیں دی جاتی تھی۔

اس دور کے آخر میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ہندوستان میں فن حدیث کی اشاعت کی طرح ڈالی لیکن موصوف اور ان کی اولاد اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اس فن کو اس کا اصل مقام نہ دلا سکی۔ مگر نصف صدی بعد علوم معقولات کی ترویج کی بدولت، جب فقہا کا زور کم ہوا تو شاہ ولی اللہ دہلوی کو علم حدیث کی اشاعت میں آسانی ہوگئی اور دور چہارم میں حدیث بحیثیت فن کے داخل نصاب ہوگئی۔

دور سوم:

دور سوم میں فقہ کے مقابلے میں معقولات کو جو اہمیت حاصل تھی اس میں اور اضافہ ہوا شاہ فتح اللہ شیرازی ہندوستان آئے اور دربار اکبری نے انہیں عضد الملک کا خطاب دے کر عزت افزائی کی انہوں نے نصاب میں مزید تبدیلیاں کیں، ان کی تفصیل شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی تصنیف جزولطیف میں یوں دی ہے:

نحو:	کافیہ، شرح جامی
اصول فقہ:	حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح
منطق:	شرح شمسیہ، شرح مطالع
بلاغت:	مختصر ومطول
فلسفہ:	شرح ہدایۃ الحکمۃ
ہیئت وحساب:	بعض رسائل مختصرہ
کلام:	شرح عقائد نسفی مع حاشیہ خیالی، شرح مواقف
طب:	موجز القانون
فقہ:	شرح وقایہ، ہدایہ
حدیث:	مشکوۃ المصابیح

شمائل ترمذی کامل، بخاری کا کچھ حصہ

تفسیر: مدارک، بیضاوی

تصوف: عوارف المعارف و رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد الفصوص

شاہ ولی اللہ کی شخصیت اس دور کے آخر میں ابھرتی ہے۔ آپ نے مذکورہ نصاب درس پڑھنے کے بعد حرمین میں شیخ ابوطاہر مدنیؒ سے علم حدیث کی تکمیل کی اور بقول مولانا عبیداللہ سندھیؒ شیخ ابوطاہر مدنیؒ سے وحدت الوجود کے فلسفہ کے اسرار وغوامض سے آگاہی حاصل کی اور بعد میں اسی کی مدد سے حیات وکائنات کے لیے ایک مکمل نظام فلسفہ کو مرتب فرما دیا جس کی بنیاد قانون حرکت وتغیر پر استوار کی گئی تھی شاہ صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج و اشاعت میں صرف کیا۔ کیونکہ علم حدیث ہی تمام دینی علوم کا سرچشمہ ہے۔

دور چہارم:

دور چہارم، دراصل شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا دور ہے اس دور میں شاہ صاحب کی شخصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے، دور سوم کے نصاب درس میں جن کتب معقولات کا اضافہ ہوا تھا، اس دور چہارم میں اس میں مزید ترقی ہوئی اس دور کے نصاب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہی علوم کے مقابلے میں منطق، حکمت، کلام، فلسفہ، بلاغت، تاریخ، جغرافیہ، طب ہیئت، تصوف، ریاضی، اقلیدس (جیومیٹری) اور نحو جیسے غیر دینی علوم کی تعداد زیادہ ہوگئی اور خود شاہ ولی اللہ نے اپنی گرانقدر تصنیفات سے معقولات میں قابل قدر اضافہ کیا۔

حضرت شاہ صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی دینی مسئلہ کو بیان کرنے سے پہلے اس کے عقلی اصول کی وضاحت کرنے اور اس کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل دریافت

کرتے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات، البدور البازغہ اور دیگر تصانیف کا مطالعہ اس منہاج کی تحقیق کو واضح کرتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے عہد میں، فرانس، روسو کے کام سے آشنا ہو چکا تھا اور والیٹر اور انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے والی جماعت جس میں دیدور اور مانٹیگو جیسے فضلا شامل تھے، کام کر رہی تھی۔ اسی عہد میں جرمنی کے اندر کانٹ مابعد الطبیعات پر تنقید کر رہا تھا اور شاہ صاحب کی وفات کے دوسرے سال کانٹ کا مشہور شاگرد ہیگل پیدا ہوا۔

شاہ صاحب کی وفات کے پورے اٹھائیس سال بعد فرانس میں انقلاب کامیاب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے تحریک عقلیت نہ صرف سارے مغرب میں پھیلی بلکہ نپولین اور برطانیہ کی افواج نے ایشیاء کے بیشتر ممالک میں اس سائنسی عقلیت کا بیج بو دیا۔ اگرچہ اس دور کا بانی ملا نظام الدین کو قرار دیا جاتا ہے اور ملا نظام الدین کی اہمیت صرف یہ ہے کہ درسیات کا ماہر ہونے کی حیثیت سے اس نے ایک ایسا نصاب ترتیب دیا جس کی وجہ سے طلباء میں ''وسعت نظر'' اور ''قوت مطالعہ'' پیدا ہوسکتی تھی، اگر درس نظامی میں شامل کتب کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کو بھی شامل کر دیا جاتا اور وجہ فضلیت ان کی تکمیل کو قرار دیا جاتا تو آج پاک و ہند کا نقشہ اور ہوتا۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک سیاسی سازش کے تحت حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کو طلباء کے زیر مطالعہ نہیں آنے دیا گیا۔ مدرسہ دیوبند کے قیام کے بعد یہ توقع ہوسکتی تھی کہ شاہ صاحب کی کتب داخل درس کرائی جائیں مگر افسوس مدرسہ کے ارباب حل و عقد نے حضرت شیخ الہندؒ کے ایام اسیری کے دوران ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس طرح شاہ صاحب کی انقلابی تعلیمات ایک بار پھر طالب علموں کے سامنے آنے سے روک دی گئیں۔ ورنہ عالم اسلام سے آنے والے طلباء اگر شاہ صاحب کی کتب کا مطالعہ کر لیتے تو نہ صرف ہندوستان میں ایک عمرانی انقلاب برپا ہوجاتا بلکہ عالم اسلام بھی شدید طور پر متاثر ہوتا، بہرحال حضرت شاہ صاحب کے ترتیب

دیے ہوئے نصاب درس کی جگہ درس نظامی نے لے لی اور یہی آج تک مدارس میں پڑھایا جاتا ہے اور اس نصاب درس نے جس قسم کے ذہن پیدا کیے ہیں اور اس سے معاشی، سیاسی اور تہذیبی میدان میں جو نتائج برآمد ہوئے ہوئے ہیں وہ محتاج تبصرہ نہیں ہیں۔ درس نظامی میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

صرف:	میزان منشعب، صرف میر، سنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ
نحو:	نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی
منطق:	صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی مع میر، سلم العلوم
حکمت:	میبذی، صدرا، شمس بازغہ
ریاضی:	خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس، مقالہ اولی، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمینی، باب اول
بلاغت:	مختصر معانی، مطول تا، مانا قلت
فقہ:	شرح وقایہ اولین، ہدایہ آخرین
اصول فقہ:	نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت، (مبادی کلامیہ)
کلام:	شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف
تفسیر:	جلالین، بیضاوی
حدیث:	مشکاۃ المصابیح

ملا نظام الدین کا طریقہ درس یہ تھا کہ وہ کتاب کو محض ذریعہ تعلیم قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے۔

دور پنجم:

شاہ ولی اللہ کے آخری عہد میں ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی طاقت مرکزی

طور پر روبہ زوال تھی۔ پلاسی کی لڑائی (۱۷۵۷ء) میں سراج الدولہ کی شکست سے کلکتہ اور اس کے قرب و جوار پر انگریز کا قبضہ ہوگیا، شاہ صاحب کی وفات کے بعد دہلی کی مرکزیت بھی خطرہ میں پڑگئی تھی۔

شاہ صاحب کی تعلیمات کی خوبی یہ ہے کہ ان میں نظریاتی فلسفے کے ساتھ ساتھ عملی فلسفے کی تعلیم بھی دی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم ذہن منطق، کلام اور بلاغت کی قیل و قال سے آزاد ہو کر زندگی کے عملی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے اور وہ اپنے اردگرد کی داخلی اور خارجی جارحانہ طاقتوں کو جو اس سے اقتدار چھیننے کے لیے سرگرم عمل ہیں، سمجھ سکے اور ان کے خلاف موثر قدم اُٹھایا جاسکے مگر اس دور میں جو انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے، ملا نظام الدین کے مرتب کردہ نصاب درس میں بھی تبدیلیاں کردی گئیں۔ شاہ صاحب کی منشاء کے خلاف اس ترمیم شدہ نصاب درس میں منطق قیل و قال کے لیے کتب کا اور اضافہ کردیا گیا۔ عربی ادب پر توجہ کم کردی گئی اس طرح حدیث و تفسیر کی تعلیم مغلوب ہوگئی۔ تاریخ اور جغرافیہ جیسے معاشرتی علوم خارج از نصاب ہوگئے۔

شاہ ولی اللہ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم نے شاہ ولی اللہ کو قرآن پڑھاتے وقت بیضاوی و جلالین سے امداد نہیں لی۔ کیونکہ اس طرح ان کے اپنے عہد کے مسائل سامنے نہ آتے۔ جس میں قرآن کا مطالعہ کیا جارہا ہے، متن کی تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر وتشریح میں وقت کے زندہ مسائل پر غور کیا جائے۔ اس ذہنی تربیت کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب نے اپنے عہد کے معاشرہ کو بدلنے کے لیے ایک ''سیاسی تحریک'' کی داغ بیل ڈال دی جو چند وجوہ کی بنا پر کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔

درس نظامی میں پہلے ہی معاشرتی علوم کو نظر انداز کردیا گیا تھا لیکن دور زوال میں اسے مزید غیر عملی اور معاشرتی زندگی سے لاتعلق کردیا گیا تھا اور یہ نصاب آج تک تمام جگہوں پر پڑھایا جاتا ہے اور اس محدود مقاصد کے حامل نصاب کے ذریعہ وہ فکر و نظر

پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو عہد حاضر کے سائنسی انکشافات اور ٹیکنالوجی کو سمجھ سکے۔ اس عہد میں جب کہ انسان نے زمان و مکان کی طاقتوں کو مسخر کرلیا ہے اور چاند کی سرزمین اس کے قدموں تلے آچکی ہے دین کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے ایسے نصاب درس پر اکتفا کرنا اور جدید عصری تقاضوں سے روگردانی یقیناً حیرت انگیز بات ہے۔

درس نظامی کا موجودہ نصاب حسب ذیل ہے:

صرف:	میزان منشعب، سنج گنج، زبدہ، دستور المبتدی، صرف میر، گزشتہ نصف صدی سے علم الصیغہ، فصول اکبری، شافیہ
نحو:	نحو میر، مائۃ عامل، شرح مائۃ عامل، کافیہ، شرح جامی
بلاغت:	مختصر معانی، مطول تا ما انا قلت
ادب:	نفحۃ الیمن، معلقات، دیوان متنبی، مقامات حریری، حماسہ
فقہ:	شرح وقایہ اولیں، ہدایہ آخرین
اصول فقہ:	نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت (آخر الذکر کتاب اصول فقہ میں ہے لیکن حصہ زیر درس درحقیقت علم کلام کا ٹکڑا ہے۔ اس لیے اس کو علم کلام میں داخل سمجھنا چاہیے)
منطق:	صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملاحسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، میر زاہد، رسالہ، حاشیہ غلام یحییٰ، بر میر زاہد ملا جلال اور کہیں کہیں بحر العلوم، شرح سلم، حاشیہ عبدالعلی بر میر زاہد رسالہ اور شرح سلم ملا مبین بھی داخل نصاب ہے۔
حکمت:	میبذی، صدرا، شمس بازغہ
کلام:	شرح عقائد نسفی، خیالی، میر زاہد امور عامہ

ریاضی: تحریر اقلیدس مقالہ اولی، خلاصۃ الحساب، تصریح شرح تشریح، شرح چغمینی

فرائض: شریفیہ

مناظرہ: رشیدیہ

تفسیر: جلالین، بیضاوی (صرف چند پارے)

اصول حدیث: شرح نخبۃ الفکر

حدیث: بخاری، مسلم، موطا، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ

دور اول سے لے کر آج تک اگر کتب نصاب پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں پڑھائے جانے والے علوم کی بنیاد منطق استخراجی پر ہے اور اس منطق کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قضیہ کبریٰ (Genral Proposition) کی صحت کو خارجی حقیقت کے معیار پر جانچا نہیں جاتا، صرف فکر کے داخلی رشتوں کی تصحیح کو مدنظر رکھا جاتا ہے، یعنی اگر اس بات کو ثابت کرنا ہو کہ تمام میزیں پھول ہیں تو یوں کہا جائے گا کہ تمام میزیں پھول ہیں۔ (قضیۂ کبریٰ) لکڑی کا ڈھانچہ میز ہے (قضیہ صغریٰ) لہٰذا یہ بھی پھول ہے۔

اس مثال میں فکر کے داخلی رشتوں کی صحت مندی تو موجود ہے لیکن خارجی حقیقت کے ساتھ تطابق موجود نہیں یعنی قضیۂ کبریٰ غلط ہے۔ میزیں پھول نہیں ہوا کرتیں۔ اسی ایک مثال سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ہمارے قدیم فکر میں صحت مندی کا وجود کہاں تک موجود ہے۔

یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ مسلم سائنسدان اور فلسفیوں نے اس منطق پر جو تنقیدیں کی تھیں اور اس کی جگہ منطق استقرائی کی صحت پر جو روشنی ڈالی تھی اسے درسی نصاب میں شامل نہیں کیا گیا اگر ایسا کرلیا جاتا تو بیکن اور مل (Mill) سے بہت پہلے فکر

انسانی کی شب تاریک میں نئی صبح نمودار ہوجاتی اور آج نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ کا نقشہ بھی اور ہوتا۔

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اگر اس غلطی کی نشان دہی کی جاتی ہے تو اکثر علماء کے ماتھوں پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ موجودہ تغیر پذیر معاشرے کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں، اور مروجہ نصاب کو یکسر تبدیل کرنا گویا موجودہ مسندوں سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے۔

اسی عہد میں قضیہ اولیٰ یا تعمیم کو اس وقت تک مدون ہی نہیں کیا جاتا جب تک اس کی معروفی صحت مندی کا تعین نہ ہوجائے۔ آج تو منطق بھی بے پناہ ارتقائی مراحل طے کرچکی ہے۔ جدلیاتی منطق نے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرلی ہے مگر ہمارے علماء کرام آج بھی منطق قیاسی پر اکتفا کیے بیٹھے ہیں۔

آج درس نظامی اپنی افادیت اس لیے کھو بیٹھا ہے کہ جس عمرانی نظام نے اس عقلیت اور انداز نظر کو جنم دیا تھا اور جس کے عزائم و مقاصد کی حفاظت کے لیے یہ نصاب معرض وجود میں آیا تھا، وہ نظام حیات، وقت کے ہاتھوں خود شکست کھا چکا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا معاشرہ اور معاشرتی نظام وجود میں آگیا ہے جو اپنے مزاج اور ہیئت دونوں میں اس سے بالکل جدا اور ممتاز ہے۔

انسانی معاشرے کا یہ معروضی قانون ہے کہ فکری اور سیاسی ادارے، رائج الوقت معاشی نظام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک خاص معاشی نظام میں معاشرے کی ارتقائی حرکت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہ تبدیلیاں اہم مرحلہ پر پہنچ کر مروجہ معاشی نظام کی پوری ہیت کو بدل دیتی ہیں اور ایک نیا معاشی نظام جنم لیتا ہے، جو اپنے پیش رو معاشی نظام کے فکری اور عمرانی ڈھانچہ کو اپنے مزاج اور منطقی تقاضوں کے مطابق بدلنا شروع کردیتا ہے تا آنکہ معاشرے کے فکری، تعلیمی اور سیاسی ادارے وقت کے

منطقی تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو بدل لیتے ہیں۔

درس نظامی کے آخری دور کو بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اس عہد کے ہندوستان میں ایک ایسا نظام رائج تھا جسے اسلامی نظام کہنا بے حد مشکل ہے۔ یہ نظام اسلام پر نہیں بلکہ جاگیردارانہ فکر پر مبنی تھا۔ اس نظام کا فکری پہلو قیاسی عقل پر مبنی تھا، قیاس یا استخراجی عقلیت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نتائج تک پہنچنے میں تجربہ و مشاہدہ سے کام نہیں لیتی، بلکہ قضیۂ کبریٰ ہی سے نتائج کا استنباط کرتی ہے، جاگیرداوری معاشرہ کی بنیاد اکائی ''خاندان'' تھا جو گاؤں میں بستا تھا، اور گاؤں شہر میں واقع ہونے والی سیاسی تبدیلیوں سے عام طور پر محفوظ رہتا تھا۔ اس لیے درایت کی بجائے روایت پر زور دیا جاتا تھا، روایت اور رسم و رواج کے ماتحت ہی تمام معاشرتی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں، روایت کی حفاظت کے لیے جان تک کی بازی لگا دی جاتی تھی۔

لیکن انگریز کے آنے کے ساتھ ہی یہ سارا جاگیرداری نظام ختم ہوگیا۔ اب کپڑا بنانے کے لیے کھڈی کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ عقل قیاسی کی جگہ عقل تجربی واستقرائی نے لے لی۔ ہر نظریہ اور واقعہ کو اپنی صحت مندی ثابت کرنے کے لیے تجربہ و مشاہدہ کی کٹھن راہ سے گزرنا پڑتا تھا اور یہ پوری طرح سمجھ لیا گیا کہ اگر قضیۂ کبریٰ معروضی حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھے گا، نتائج درست نہیں ہوں گے، مشین کی وجہ سے خاندان کی سالمیت اور اکائی ٹوٹ گئی۔ ایک خاندان کے افراد کو جہاں ملازمت ملتی انہیں مجبوراً وہاں جانا پڑتا۔ شہروں میں زندگی بسر کرنے کی سہولتوں کے بڑھ جانے سے گاؤں کے افراد شہروں میں آکر بسنے لگے۔ اس طرح گاؤں کی خوف کفیل او الگ تھلگ زندگی ختم ہوگئی۔ روایت کی جگہ درایت نے لے لی، نئے تعلیم یافتہ طبقے رسم و رواج کے بندھنوں کے خلاف بغاوت کرنے لگے، خاندانی روایات پر زور کم ہوتا چلا گیا۔

ان تمام واقعات اور تبدیلیوں کا تقاضا تھا کہ از سر نو تعلیمی نصاب کا جائزہ لیا

جائے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ نئے نظام حیات اور اس کے فکری اور عمرانی تقاضوں کو سامنے رکھ کر کوئی منصوبہ تیار کیا جائے ورنہ ہر قدم ترقی و فلاح کی راہوں سے آشنا نہیں ہو سکے گا۔

اس تاریخی اور معاشرتی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمارے سامنے مصر کی جامع ازہر اور برطانیہ کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی زندہ مثال موجود ہے۔ مصر اور برطانیہ کی یہ یونیورسٹیاں ایک ہی تاریخی عہد یعنی بارھویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں قائم ہوئیں۔ مگر برطانیہ کے عمرانی نظام میں تبدیلیاں آنے کی وجہ سے آکسفورڈ اور کیمبرج کی دانش گاہیں ترقی کر گئیں۔ جن سے نئے علوم و فنون کی روشنی لے کر مختلف ممالک کے طالب علم دنیا کے ہر حصہ میں پہنچ گئے جب کہ مصر اپنے فرسودہ نظام کے ساتھ وابستہ رہنے کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا لہٰذا جامعہ ازہر سائنس اور ٹیکنالوجی کی برکتوں سے محروم رہ گئی لیکن جب انقلابی حکومت نے شاہی نظام کی بساط اُلٹ دی۔ تو ازہر کے نصاب اور دوسرے تعلیمی معاملات کی نوعیت بھی بدل گئی۔ آج ازہر اگرچہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی سطح تک تو نہیں مگر اپنے سابقہ مقام اور ہیئت سے کئی منازل آگے نکل گئی ہے اور جوں جوں جامعہ ازہر وقت کے تقاضوں کو سمجھتا جائے گا اس کے قدم تیزی سے ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھتے جائیں گے۔ ہمارے اپنے ملک میں علی گڑھ اور دیوبند کی مثال بھی موجود ہے۔ علی گڑھ نے جاگیرداری نظام کی عقلیت کی جگہ جدید وقت کی سائنسی عقلیت کو قبول کرلیا اور اس کے فارغ التحصیل زندگی کے تمام اداروں میں قیادت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ مگر دیوبند والے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور مجموعی طور پر وہ آج کی عملی زندگی میں بھرپور حصہ لینے سے قاصر ہے۔ لہٰذا اس تاریخی شہادت سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ جب تک پاکستان میں زندگی جدید وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرے گی قدیم طرز کے تعلیمی ادارے پسماندگی کا شکار رہیں گے۔ چنانچہ ہمارے تدامت پسند ذہن جتنی جلد اس حقیقت کی تاریخی اہمیت کو سمجھ کر اپنے اندر تبدیلی پیدا

کرلیں گے اتنی جلد جدید تعلیم کی افادیت سے بہرہ اندوز بھی ہوں گے۔ اس طرح سے وہ نہ صرف اپنے معاشرتی مقام کو بلند کرنے میں مدد دیں گے بلکہ پاکستانی معاشرہ اور ذہن کے آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

ہمارے یہاں اہل دیوبند کی بڑی عزت ہے، انہوں نے مقدور بھر قومی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس نے ایسے تخلیقی ذہن پیدا نہیں کیے جو جدید تقاضوں کے مطابق قرآن اور اسلامی علوم کی نئی تدوین کی اہلیت رکھتے۔ ظاہر ہے حالیہ درس نظامی اس المیہ کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب تک ہمارے دارالعلوم میں پرانے زمانے کا وضع کردہ یہ نصاب تعلیم جاری ہے، اصلاح حال کی کوئی امید رکھنا مشکل ہے۔ زندگی اپنی ذمہ داریوں سے سرخرو تبھی ہوسکتی ہے جب عصر حاضر کے جدید تقاضوں اور نئی سائنسی انداز فکر کی روشنی میں اسلامی ادب کے عظیم اثاثہ کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے اور یہ کام نہ تو علی گڑھ کی دانش گاہ کرسکتی ہے اور نہ ہی دیوبند کی عقل قیاسی، اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان دونوں اداروں کے نقطہ ہائے نظر میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

بہرحال اس مطالعہ سے اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ آج کی طرح کبھی بھی دینی اور دنیوی مدارس الگ الگ نہیں تھے، ایک ہی درسگاہ میں جہاں حدیث وتفسیر کا علم پڑھایا جاتا تھا وہیں اس عہد کے دوسرے دنیوی علوم کا درس بھی دیا جاتا تھا درس نظامی جن مضامین پر مشتمل ہے انہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص دینی نصاب نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف علوم وفنون پر مبنی ہیں منطق، فلسفہ، قانون، طب، ریاضی اور جیومیٹری وغیرہ اگر آج دینی علوم نہیں ہیں تو اس دور میں بھی نہیں تھے۔

جس طرح آج ہم سمجھتے ہیں کہ جدید ادب، طبیعات، کیمیا، فنون لطیفہ، معاشیات، سیاسیات اور منطق وفلسفہ پڑھنے سے قرآن وحدیث کے غوامض کو سمجھنے میں مدد

ملتی ہے۔ کیونکہ یہ علوم حیات ذہنی اور عمرانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے اور ان میں کام کرنے والے فطری قوانین کا انکشاف کرتے ہیں اور جب ہم ان علوم میں دستگاہ حاصل کرتے ہیں تو ان فطری قوانین کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ ہمارے قدیم بزرگوں نے بھی اس حقیقت کو سمجھ کر اپنے عہد کے تمام علوم پر مشتمل ایک نصاب مرتب کیا اور ان علوم کی تحصیل کے بعد جس طرح کا انداز نظر (Out look) پیدا ہوا اس سے علماء کرام نے قرآن، حدیث اور فقہی مسائل کی تفسیر تشریح کی۔

یورپ میں صنعتی اور سائنسی نقطہ نظ کی وجہ سے علم وفنون میں ترقی کا آغاز ہوا اور زندگی کے ہر شعبے اور علم وفن کی ہر شاخ میں جدید معلومات و افکار کا ایک بیش بہا خزانہ جمع ہوگیا۔ درس نظامی کے وہ علوم وفنون جو ہیئت، ہندسہ، منطق اور علم الکلام وغیرہ پر مشتمل تھے نظر ثانی کے محتاج ہوگئے کیونکہ نئی معلومات کی وجہ سے ان میں بے حد اضافہ ہو چکا ہے اور ان کے کئی حصے غلط اور بے تکے ثابت ہو چکے ہیں۔

جب یورپ سے درس نظامی میں پڑھائے جانے والے مضامین مزید تحقیق سے اضافہ پذیر ہوکر برصغیر و پاکستان میں پہنچے تو ان کی تعلیم سے بھی ایک انداز نظر پیدا ہوا۔ جو ظاہر ہے کہ قدیم انداز نظر سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ سرسید، مولوی چراغ علی اور مفتی محمد عبدہ جیسے لوگوں نے اس ترقی یافتہ انداز نظر سے قدیم تفاسیر، علم الکلام اور دوسرے دینی مضامین میں قابل قدر اضافے کیے، اور ان کو نئے سرے سے مدون کیا، وہاں اس کوشش میں اپنے قدیم بزرگوں کی آراء اور نقطۂ نظر سے اختلاف بھی کیا، مگر عربی مدارس میں درس نظامی پڑھنے والے بزرگ چونکہ ان کے ترقی یافتہ انداز نظر سے، جو نئے علوم کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا۔ واقف نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے ان جدید اضافوں اور نئی تنقید کو دین میں تحریف کے مترادف خیال کیا۔

برطانیہ کے سیاسی اقتدار کے ساتھ یہ تمام ترقی یافتہ علوم وفنون بھی برصغیر پاک

و ہند میں درآمد ہوئے۔ ہندو نے، جو سات ہزار سالہ پرانی تہذیب کا حامل ہے، ان نئے علوم و مباحث کو لبیک کہا اور تیزی کیس اتھ انہیں حاصل کرنے میں منہمک ہوگیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے ان جدید علوم وفنون کو اپنانے میں ہچکچاہٹ محسوس کی ان کا خیال تھا کہ جدید علوم کو اپنانے سے انگریز کے ساتھ سیاسی جنگ لڑنے میں ذہنی دشواری پیدا ہوجائے گی اور سیاسی جدوجہد میں رکاوٹ ڈالنے کا سبب بنے گا، اس کے علاوہ اس کے خیال میں جدید علوم وفنون کی تحصیل سے دھریت اور مذہب سے بیگانگی کے رجحان کو تقویت ملے گی، اس طرح ملت اپنے تہذیبی مرکز ثقل سے ہٹ جائے گی اور اس کی ملی زندگی کے تسلسل میں ایک خوفناک خلاء پیدا ہوجائے گا اور اس خلاء کی وجہ سے مسلم قوم نہ صرف سیاسی میدان میں اپنی شکست کا ازالہ نہیں کرسکے گی بلکہ وہ تہذیبی، عملی اور معاشرتی میدانوں میں بھی انگریز اور ہندو، دونوں سے مات کھا جائے گی اور ایک ایسا زبردست نقصان پہنچے گا جس کی تلافی کے لیے شاید کئی صدیاں بھی کافی نہ ہوسکیں۔

اگرچہ ہمارے قابل احترام دینی رہنماؤں کی اجتہادی غلطی تھی اس غلطی سے ملی وجود میں قدیم و جدید اقدار کے درمیان حسین امتزاج پیدا نہ ہوسکا۔ بلکہ قوم دو مستقل حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک حصہ جدید علوم وفنون سے آراستہ ہونے کے باوجود اپنی مذہبی اور تہذیبی اساس سے الگ ہوگیا اور دوسرا مذہبی اور قدیم علوم وفنون کی تحصیل کے باوجود زندگی کے جدید تقاضوں کو سمجھنے اور انہیں پورا کرنے سے قاصر رہ گیا۔

جدید علوم نے برطانیہ کی سیاسی اور تہذیبی قیادت کی روح سمجھنے میں بے حد مدد دی۔ سائنس نے سیاست، معیشت، کیمیا اور طبیعات وغیرہ میں جن جدید حقائق کو منکشف کیا تھا اور ان انکشافات کی وجہ سے کائنات اور زندگی کے متعلق جس جدید نقطۂ نظر اور تصور نے جنم لیا تھا اس تصور کی مدد سے قرآن حکیم کی تعلیمات پر نئے سرے سے غور کیا جانے لگا اور اس طرح ایک جدید علم الکلام کی تدوین عمل میں آنے لگی۔ جس کی مدد سے

مغرب کے سامنے اسلام اور اس کے اعلیٰ و ارفع حقائق کو پیش کرنے کی ایک نئی جرأت پیدا ہوگئی اور ایک نئی راہ کھل گئی۔

اس کے برعکس ہماری دینی اور مذہبی قیادت کی قدامت پسندی اور تقلید کی وجہ سے اگرچہ اسلام کے چودہ سو برس کے تہذیبی اثاثہ کی حفاظت کا سامان مہیان ہونے کے علاوہ دین اسلام کی روایتی شکل میں محفوظ ہونے میں بڑی حد تک ضمانت مل گئی، ہمارا مذہبی طبقہ اور اس کے محترم رہنما اگر اپنے تہذیبی اثاثہ اور دین حق کو اس کی بنیادی شکل میں محفوظ کرنے کی کوشش نہ کرتے تو ملت اسلامیہ پاک و ہند کے لیے ایک المناک سانحہ ہوتا۔ جس سے مسلمان چاہے کتنے ہی جدید علوم حاصل کرلیتا مگر اپنی ممتاز تاریخی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھتا۔ مگر اس قابل قدر کوشش کے باوجود مذہبی قیادت جس انداز سے ماضی پرستی اور تقلید جامد کے تصورات پر قائم رہی اس کی وجہ سے ملت کو جو سب سے زیادہ نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ اس کی فکری سالمیت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، اس کی تاریخی اور تہذیبی شخصیت کا سارا تارو پود بکھر کر رہ گیا۔ حیات ملی کی جوئے روان مختلف شاخوں میں بٹ گئی اور اس تقسیم کی وجہ سے اس کی وہ تندی و تیزی جاتی رہی جس کی وجہ سے اس نے کسی وقت اپنے راستہ میں آنے والی قدیم بت پرست مادی تہذیبوں کو خس و خاشاک کی طرح نہ صرف ایک طرف پھینک دیا تھا بلکہ ان کے اجزائے ترکیبی کو ہمیشہ کے لیے منتشر کردیا تھا۔

اس عہد میں قدیم اور جدید نظام اور درسگاہو کی فضا اور نصاب میں کتنا بعد پیدا ہو چکا ہے اسے معلوم کرنے کے لیے ان دونوں کا باہمی موازنہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی دارالعلوموں میں تعلیم پانے والے طلبہ کو بعض ایسی کتب پڑھائی جاتی ہیں جن کے مضامین جامد اور ٹھٹھرے ہوئے ان کے اوراق مرور ایام کی گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔ ان مدرسوں کی چار دیواری کے اندر عہد جدید کے علم و ثقافت کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی تیز وشنی کی ایک کرن تک نہیں پہنچی، ان میں طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ تسخیر فطرت کا عمل

اور سائنسی علوم وفنون غیر مذہبی چیزیں ہیں۔ عہد حاضر کا انسان فطرت، معاشرہ اور نفس کے متعلق اپنی تحقیق و کاوش سے جتنا علم منکشف کررہا ہے۔ یہ علم الٰہی کا حصہ نہیں ہے اگرچہ فطرت، معاشرہ اور انسانی شعور ونفس کو اللہ ہی نے تخلیق کیا ہے۔ اور ان میں کام کرنے والے قوانین بھی اسی نے وضع کیے ہیں، مگر اس تخلیق اور اس کے قوانین کے علم کو علم الٰہی نہیں سمجھا جاتا۔

ان مدارس میں ملٹن، روسو، شیکسپیئر اور ٹالسٹائی وغیرہ کے تخلیق کردہ عظیم ادب سے جس میں فطرت انسانی کے غوامض و اسرار کو بہتر طور پر بے نقاب کیا گیا ہے۔ طلبا بے بہرہ رہتے ہی ہیں لیکن وہ فارسی اور عربی کے اعلیٰ ادب سے بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ فنون لطیفہ کے متعلق کچھ جاننا تو الگ رہا ان کا نام لینا ہی کفر کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ جدید فلسفہ کے متعلق سمجھ لیا گیا ہے کہ اس میں سوائے زندقہ و الحاد کے شاید اور کچھ بھی نہیں پایا جاتا، چاہے عہد حاضر کے فلسفی، مذہب کو دلائل قاطع سے کتنا ہی مسلح کر گئے ہوں، غرض ذہن اور ذوق جمال کی پرورش اور جلاء کے لئے کوئی سامان مہیان نہیں کیا جاتا۔

ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے حیات حاضرہ کی شاداب اور سرسبز راہیں تقریباً مسدود رہتی ہیں ایسی مفلس اور مایوس کن فضا میں جس قسم کے وسعت پذیر ذہن کی تعمیر ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ دامن حیات کو علم وتہذیب کے انمول موتیوں سے مالا مال کرسکتا ہے بے جا ہوگا۔

اس کے برعکس یونیورسٹیوں اور ان کی اقامت گاہوں کی صاف اور علم پرور فضا ہمارے سامنے ہے، ان کی پرشکوہ عمارتیں، ان کے شاداب سبزہ زار، ان کی تازہ ہوا اور روشنی سے بھرپور اقامات گاہیں، ان کے وسیع وعریض لیکچر ہال، اور تعلیمی کمروں کے آگے طویل وعریض برآمدے ہزاروں اور لاکھوں کتابوں پر مشتمل لائبریریاں ان کی چار دیواری کے اندر چار دانگ عالم سے تازہ بتازہ اور نوبہ نو تحقیق شدہ علم کھچا چلا آتا ہے، اجلے لباس

پر سیاہ طیلسان پہنے ہوئے اور ہاتھوں میں جدید ترین علوم پر مشتمل بھاری بھرکم کتابیں لیے طلبہ و طالبات کے گروہ، ذوق جمال کی پرورش کے لیے ادب عالیہ کی تعلیم کا بندوبست. ان کی زمان و مکان پر کمند ڈالنے اور فطرت کے پوشیدہ بھیدوں کو بے نقاب کرنے والی تجربہ گاہیں ان کے ذہنوں کو بے حد وسعت اور ہر نئے تجربہ کو اپنانے کی صلاحیت عطا کرتی ہیں، ان یونیورسٹیوں میں کائنات کے گوشوں کو کہاں تک کھنگالا گیا ہے اور اس سے انسان کے ذہنی عروج کی کیا کیفیت ہے ایک اقتباس کے، ذریعے اس کا عکس پیش خدمت ہے:

> ''آئین سٹائین کہتا ہے۔ کائنات محدود مگر بیکران ہے، ایک طرف سے آواز آتی ہے کائنات ہر لحظہ بدل رہی ہے دوسری طرف سے شور اُٹھتا ہے کائنات سکڑ رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مادہ فنا ہو کر اور توانائی میں تبدیل ہو کر فضا میں بکھر رہا ہے لیکن ساتھ ہی خبر آتی ہے کہ بیرونی فضا میں دور کہیں مادے کی تخلیق ہو رہی ہے۔ ادھر مادے اور نور کی ثنویت اور مادے کی تقسیم در تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی انقلاب آفرین نظریہ کے قریب آپہنچے ہیں جو پرانی گتھیوں کو سلجھا کر کائنات کے معمے کا حل سمجھائے گا۔ (جدید طبیعات کا تعارف)

اس موازنہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ جدید علوم اور ان کی درسگاہیں طلبہ و طالبات کے ذہنوں کو علم کی کیسی کیسی بلندیوں اور وسعتوں تک رسائی حاصل کرنے کی قابلیت بخش رہی ہیں۔ مگر ہمارے قدیم مدارس میں ابھی تک ارسطو کی ہیئت، منطق قیاسی اور قدیم کلامی مباحث پڑھائے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان درسگاہوں میں پروان چڑھنے والے ذہن نہ تو جدید علوم کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ ان میں زندگی کی جدید اقدار کو

اپنانے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اپنے عہد عروج میں مسلم ذہن نے فیثقی، بازنطینی، کلدانی اور رومی و یونانی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کو حاصل کیا تھا۔ اس میں قابل قدر اضافہ کرکے انسانیت کے علمی اور تہذیبی ورثہ کو زیادہ پر مایہ بنانے میں مدد دی تھی۔ چند تاریخی اسباب کی وجہ سے مسلم ذہن زوال پذیری کے بھنور میں پھنس گیا اور اس وجہ سے اس عقلی تحریک کو آگے بڑھانے میں قابل قدر طور پر مزید حصہ نہ لے سکا جسے کسی وقت اس نے خود پروان چڑھایا تھا۔

فطرت کے ازلی قانون کے ماتحت جب مشینی صنعت اور سائنسی عقلیت نے پسماندہ، غیر ترقی یافتہ اور قیاسی عقلیت کے حامل جاگیرداری نظام کو شکست دے کر اس کی جگہ خود لے لی تو مغربی اقوام نے مسلمانوں سے اس عقلی تحریک کی قیادت چھین کر اسے آگے بڑھانے کی کوشش شروع کی اور قدیم علوم وفنون کو اس حد تک ترقی دی کہ وہ اپنی ترقی یافتہ شکل میں خود مسلمانوں کے لیے بیگانہ بن گئے۔

دینی اور دنیوی تعلیم کا وقت اب پورا ہو چلا ہے اور بہت ہی کم عرصہ رہ گیا ہے کہ جس میں یہ انداز نظر دو چار سانس اور لے سکتا ہے، یہ فیصلہ تاریخ کے ارتقائی عمل کا ہے جو حق تعالیٰ کے دوامی تخلیقی عمل کا دوسرا نام ہے لہٰذا یہ سمجھنا کہ درس نظامی کوئی آسمانی نصاب ہے جس میں رد و بدل کرنا گناہ عظیم ہے ایک غیر عقلی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ درس نظامی کے مطالعہ سے دینی مسائل سمجھنے کے لیے ٹھوس علمی ذہن پیدا ہوتا ہے، اگرچہ یہ بات کسی حد تک ٹھیک ہے مگر یہ ٹھوس علمی ذہن اسی ادب کا مطالعہ کرسکتا ہے جو درس نظامی کی اصطلاحی زبان میں لکھا گیا ہو۔ مگر اس کے برعکس صحیح راستہ یہ تھا کہ ہمارے مذہبی ازہان جدید علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ درس نظامی کی زبان کا مطالعہ بھی کرتے اور ان دینی علوم کو آج تک زندہ علمی زبان میں نئی نسلو کے لیے پھر سے مدون کردیتے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بات کا امکان پیدا ہوگیا تھا کہ اس تاریخی

علمی تحریک کو پھر ایک بات بھرپور طریقے سے آگے بڑھایا جائے تاکہ اقوام عالم کی قیادت شاید وقت کے کسی موڑ پر پھر ہمارے ہاتھ میں آجائے مگر افسوس ہے کہ جدید علوم کے حاملین کی بے توجہی اور علماء کے تشدد پسند موقف نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔ آج بھی دو صدی پہلے کے دار العلوم اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے بے رونق ہیں۔ اور جدید یونیورسٹیاں ایسے افراد اُگل رہی جو نہ صرف اپنے تہذیبی اثاثہ سے نابلد ہیں بلکہ وہ مغرب کی فعال اور سیار روح سے بھی واقف نہیں ہیں۔

علمائے محترم اپنے قدیم تہذیبی اثاثہ کے محافظ کی حیثیت سے تو پھر بھی پارہ شدہ ردائے ملت کی رفوگری کی کچھ نہ کچھ اہلیت رکھتے ہیں۔ مگر ہمارے یہ جدید علوم وفنون کے حامل مغرب کی فرسودہ زوال پذیر، استحصال پسند تہذیب کی ظاہری چمک دمک کے حسن پر مرے جارہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس اخلاق باختہ عروس ہزار داماد کے خوبصورت دامن کے نیچے ایسا زہر چھپا ہوا ہے کہ جس کا تریاق روئے زمین پر کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ زہر ہمارے نوجوان ذہنوں کو خود بینی، خدا بینی اور جہاں بینی کی صلاحیتوں سے عاری کر کے ان کی روح کو شدید تہذیبی افلاس میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور نوجوان ذہن نہ تو ملت کو جدید راہوں کی طرف لے جانے کی ہمت رکھتے ہیں اور نہ ہی قدیم تہذیبی اثاثہ کو اپنا کر اس میں قابل قدر اضافہ کرنے کی قابلیت کے مالک بن سکتے ہیں۔ پاکستان کی تاسیس کے بعد سب سے اہم کام یہ تھا کہ وقت کی پہلی فرصت میں دارالعلوموں اور یونیورسٹیوں کو باہم ملادیا جاتا، ان دونوں کی جداگانہ حیثیتو کو ختم کردیا جاتا تاکہ جدید علوم مذہبی بیگانگی کے رجحانات کو پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بنتے اور قدیم مذہبی وتہذیبی علوم ماضی پرستی اور تقلید جامد جیسے خطرناک تصورات کو جنم نہ دے سکتے، جن کی موجودگی قوموں کی حیات کے لیے خودکشی کے مترادف ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم کام یہ بھی کرنا چاہیے تھا کہ فقہ اسلامی کو درس نظامی سے خارج کر کے ایل ایل بی کے نصاب کا جزو بنا دیا جاتا تاکہ ہمارے قانون دان

اسلامی قانون کی روح، اس کی ابتدا، اس کے تاریخی ارتقاء اور مختلف مذاہب فقہ کو ان کے تاریخی پس منظر میں مطالعہ کرکے جدید قانونی نظام کے ضمیر کو اسلام کے حیات پرور اور صحت مند پاکیزہ اقدار سے نئی زندگی بخشتے۔

قدیم علم الکلام کو جس کی اساس منطق استخراجی پر ہے، جدید حقائق پر استوار کیا جاتا، کیونکہ منطق استخراجی قضیہ کبریٰ کو معروضی حقیقت کے مطابق نہیں جانچتی لہٰذا اپنے استنتاج میں غلط راستہ پر پڑجاتی ہے۔ جب کہ استقرائی منطق اپنے کلیات کو مرتب کرتے وقت معروضی حقیقت ہی سے سارا مواد حاصل کرتی ہے اور اس وجہ سے استقراء قیاس محض اٹکل بچو اور غیر حقیقی مفروضات سے اپنے استنباط کے دوران محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں علم الکلام کے نظام استدلال کو سائنسی منہاس سے وابستہ کردیا جاتا تاکہ وہ اس عہد کے جدید علمی اور عمرانی تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہوجاتا۔

کسی بھی ملت کے لیے اس سے بڑھ کر المیہ اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ وہ نظریاتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوجائے، اس تہذیب، ثقافت اور تعلیم کے دو دھارے ہوجائیں جن کی سمتیں بالکل مختلف ہوں۔

مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کو وجود میں آئے ۴۷ برس گزر چکے ہیں۔ مگر یہ دو دھارے بدستور الگ بہہ رہے ہیں۔ اگر دینی مدارس پہلے کی طرح اب بھی یونیورسٹیوں سے الگ رہے تو ایک طرف تو ان دینی مدارس کے طلبہ جدید علوم وفنون کے متعلق اسلامی ہدایات سے بے بہرہ رہیں گے اور دوسری طرف ان مدارس میں پڑھائے جانے والے مضامین ان عظیم ترقیوں اور اضافوں سے ناآشنا رہیں گے جو انسانی تحقیق وکاوش سے ان مضامین میں بروئے کار آچکے ہیں۔ کیا ایسی صورت حال میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ ثنویت پسند نظام تعلیم ہمیں ایک بار پھر ابوحنیفہ، مالک، شافعی، ابن حنبل، ابن رشد، ابونصر فارابی، ابن ماجہ، وابن طفیل، ابن سینا، غزالی اور رومی، ابن عربی اور ابن خلدون جیسی عظیم

شخصیات دے سکے گا؟

ملت کے بہی خواہوں سے آج بھی ہمیں یہ توقع ہے کہ وہ پہلی فرصت میں مسلم تہذیب کے ان عظیم دھاروں کو ایک جگہ جمع کرنے کی بھرپور جدوجہد کریں گے، تاکہ اس مجمع البحرین سے ملت کا سوکھا ہوا جسم اور روح پھر سے شاداب و سرشار ہو سکے۔ اس کام میں جتنی دیر ہوگی ملت کی محرومی اور درماندگی میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ اگر یہ کارنامہ سرانجام پا گیا تو ملت اسلامیہ شاید پھر ایک بار اس قابل ہو جائے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک نئی صحت مند انسانی تہذیب کے نقوش مرتب کر لے جو آج کے دُکھی اور مایوس انسان کے دِل کو روشن مستقبل کی امنگوں سے معمور کر دے۔

❁❁❁❁❁